زیر سرپرستی
داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی

طلبہ جامعہ عارفیہ کا علمی، فکری، دعوتی اور تحقیقی ترجمان

جلد نمبر
08

شمار نمبر
01

ماہ نامہ

دعوت

وال میگزین

جولائی
۲۰۲۴ء

محرم الحرام
۱۴۴۶ھ

زیر نگرانی

شیخ حسن سعید صفوی ازہری
ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی

چیف ایڈیٹر: محمد یعقوب
نائب ایڈیٹر: نور الزماں

معاونین
آصف برکاتی ، نور الزماں، ریان فاروقی

جدید علم کلام: ضرورت و اہمیت اور تقاضے

محمد یعقوب

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت عرب کا کیا ماحول تھا یہ ہر کس و ناکس پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر جنگ کا آغاز کر دینا وہ بھی ایسی جنگ جو صدیوں تک جاری رہتی لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور آپ کی مساعی جمیلہ سے تمام لوگوں نے اپنا سر تسلیم ایک خدا اور رسول کے آگے خم کر دیا، وہ بھی اس طرح کہ ہر بات پر بے چون چراں آمنا و صدقنا کی صدائیں بلند کرتے نظر آتے۔ انہیں نہ رب کی وحدانیت اس کی ذات و صفات، رویت باری، وحی والہام اور کرامات کے متعلق کوئی اعتراض تھا اور نہ وہ اس پر بحث و مباحثہ کرتے بلکہ نبی نے جو فرمادیا وہ حق ہے، ہمیں اسی کو تسلیم کرنا ہے یہ صحابہ کا وطیرہ تھا لیکن ایک ہی صدی کے بعد حالات بدلے کیوں کہ اب اسلام صرف عرب میں محدود نہیں رہ گیا تھا بلکہ دیگر ملکوں میں بھی اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا اور اسلام کو اہل عجم قبول کرنے لگے تھے۔ اب مسلمان صرف خالص عرب نہیں تھے بلکہ ہر طرح کے نظریات کے حاملین دامن اسلام سے وابستہ ہوگئے تھے ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو افلاطونی فلسفہ کا علم رکھتے یا اس کا ذکر سن چکے تھے، اس لیے تابعین کرام کے دور ہی میں ذات باری تعالیٰ، صفات باری، رویت باری اور وحی و نبوت کے متعلق لوگ طرح طرح کے سوالات قائم کرنے لگے جس کی بنیاد پر مختلف فرقے وجود میں آئے۔ ان سوالات و اعتراضات کو رد کرنے اور ایک معتدل راہ دکھانے کے لیے امام اعظم ابو حنیفہ نے فقہ اکبر تصنیف فرمائی۔ اس دور میں اس علم کا نام فقہ اکبر تھا۔ جب ان چیزوں پر گفتگو طویل ہوئی اور کلام و مناظرہ کا آغاز ہوا تو باضابطہ علم کلام کے نام سے علمائے اسلام نے علم کلام کی بناڈالی۔ علم کلام اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے عقلی دلائل سے اسلامی اعتقادات کو ثابت کیا جاتا ہے اور وارد شدہ اعتراضات کا عقل کی روشنی میں جواب دیا جاتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون نے علم کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: علم کلام وہ علم ہے جس میں عقائد ایمانیہ کا دلائل عقلیہ سے دفاع کیا جاتا ہے اور اہل سنت و جماعت سے انحراف کرنے والوں کا رد کیا جاتا ہے (مقدمہ ابنِ خلدون ۵۰۶)

اس تعریف سے واضح ہوا کہ علم کلام میں عقائد ایمانیہ کو عقل کی روشنی میں ثابت کیا جاتا ہے اور وارد شدہ اعتراضات کا عقلی دلائل سے جواب دیا جاتا ہے۔ جو اعتراضات کرتے ہیں وہ مسلمان بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مسلم بھی معتزلہ، مجسمہ، قدریہ، جبریہ اور اسی طرح دیگر فرقے جو اہل سنت و جماعت سے خارج ہیں جو ہر چیز کا فیصلہ عقل کے ترازو سے کرتے تھے ان کے رد اور ان کے شکوک و شبہات کو زائل کرنے کے لیے لئے علمائے اسلام نے علم کلام کے نام سے ایک پلیٹ فارم تیار کیا جس سے ان کے شکوک و شبہات کو دور کیا جاسکے اور یہ کام صدیوں سے جاری ہے۔ اس میں تاریخ کی عظیم شخصیت امام غزالی کی ذات ہمارے لیے لائق تقلید ہے جو بیک وقت فقیہ، مفکر، محقق، صوفی اور متکلّم تھے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور سے تقریباً بیسویں صدی کے اوائل تک صرف اسلام کے عقائد ہی پر اعتراضات کیے جاتے تھے جن کے جوابات اہل اسلام عقل کی روشنی میں دے کر ان کو لاجواب کر دیتے تھے کیوں کہ پہلے لوگ یونانی فلسفہ کے ذریعہ اعتراضات کرتے تھے جن کا متکلّمین و محدثین جواب دیا کرتے اور شبہات کو ختم کر دیتے تھے، لیکن اب یونانی فلسفہ مفقود ہوگیا

لیکن اب بھی اہل مغرب کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں پر نت نئے انداز میں سوالات قائم کیے جاتے ہیں ۔آج اہل مغرب کو نبوت ووحی کو مصدر علم تسلیم کرنے میں تردد ہے،اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی سے یا پھر اہل کلیسا کا اقتدار ختم ہونے کے بعد اب حالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں کے چیزوں کو سوچنے سمجھنے کے طریقے مختلف ہو چکے ہیں،اس لیے کہ جب سے سائنس کو ترقی حاصل ہوئی ہے اور لوگ اس کی جانب مائل ہوئے ہیں ذہن وسیع ہوگیا ہے کیوں کہ سائنس فلسفہ کی مانند نہیں ہے کہ صرف عقل سے فیصلہ کر دیا جائے بلکہ سائنس مشاہدے کا نام ہے اس لیے اعتراضات بھی وسیع ہوگئے ہیں۔ اب اعتراضات اسلام اور مسلمانوں پر محض عقائد کی بنیاد پر نہیں کیے جاتے بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہوکر عبادات و معاملات اور اخلاقیات تک پہنچ چکا ہے اور یہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر اغیار معترض ہوں بلکہ ہمارے برداران اسلام کا وہ طبقہ جو جدید علوم کی تعلیم میں مشغول ہے،اس کی جانب سے بھی بہت سی چیزوں پر اعتراضات سن نے کو ملتے ہیں کہ یہ کیسے اور کیوں؟ اس طرح کے سوالات سن کر ان کے ساتھ تشدد سے اجتناب کیا جائے ،انہیں ملحدین اور دیگر گمراہوں کی فہرست میں شامل نہ کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے اور ان کو انہی کی زبان میں تشفی بخش جواب دیا جائے یعنی ان کے سامنے صرف عقلی دلائل ہی سے گفتگو کی جائے ان کو گمراہ و بدمذہب کہہ کر دھتکارا نہ جائے ورنہ اس کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے کیوں ہم نے اس طرح کے لوگوں کے لیے ایسا پلیٹ فارم تیار ہی نہیں کیا جس طرح ہمارے اکابرین نے اپنے دور کے اعتبار سے کیا تھا، جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں ہم نے اس کا ذکر کیا۔ یہ وقت کا تقاضا ہے کہ حالات کے اعتبار سے علم کی نشأت ثانیہ کی جائے جیسے اولا صرف علم حدیث تھا لیکن حالات نے اضافے کا تقاضا کیا کہ اصول حدیث اور اسماء الرجال جیسے فنون معرض وجود میں آئے،اسی طرح فقہ کے ساتھ ہوا کہ وقت کے ساتھ اصول فقہ کی بناڈالی گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ حالات و زمانے کی رعایت کرتے ہوئے مقاصد شرع زیر بحث لائے گئے تاکہ لوگ حرج میں مبتلا نہ ہوں اور ان کے لیے آسانی پیدا کی جاسکے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آسانی پیدا کرو لوگوں کو مشکل میں مت ڈالو (بخاری) بلکہ زمانے کے اعتبار سے جس میں اہل اسلام کے لیے آسانی ہو اس راہ کا انتخاب کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ علم کلام کے آغاز کے وقت ہی بہت سے علما اس کے خلاف تھے اور اس کی تعلیم کے بھی قائل نہیں تھے لیکن زمانے نے یہ دیکھا کہ علم کلام نے جہاں بہت سے فلسفیانہ نظریات کا رد کیا وہیں عقائد دینیہ کی ایسی توضیح و تشریح کی کہ معترضین اور اہل منطق و فلسفہ دنگ رہ گئے اس لیے دور حاضر کا بھی تقاضا ہے کہ اب پھر جدید اسلوب میں علم کلام کی تعلیم دی جائے خاص طور پر اہل مدارس اس پر توجہ دیں تاکہ وہ ایسے علما تیار کر سکیں جو علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ اور علم کلام کے اسلوب سے واقف ہوں اور بہترین اسکالرز ہوں تاکہ جس طرح ممکن ہو اپنے حصے کا کام کر جائیں یہ ایسی پکار ہے جس کا زمانہ ہم سے تقاضا کر رہا ہے کیوں کہ سلف صالحین نے اپنے دور میں اس کو سیکھا اور لوگوں کو ہدایت پر گامزن کیا اسی طرح ہماری بھی ذمہ داری ہے کہ جس علم کو دعوت و تبلیغ کے لئے ہمارے اکابرین نے اپنے خون و جگر سے سینچا ہے اس پر عمل کیا جائے اور سنت غزالی کا احیا کیا جائے۔

علم کلام کی اشاعت میں معتزلہ کا کردار

آصف برکاتی

علم کلام میں ابتدا ہی سے دو طریقے قائم ہو گئے تھے علم کلام عقلی اور علم کلام نقلی۔ نقلی علم کلام خود اسلامی فرقوں کے مقابلے میں ایجاد ہوا تھا، علم کلام عقلی فلسفہ اور دوسرے مذاہب کے مقابلے کے لیے ایجاد ہوا تھا، جس کا بانی ابو الہذیل علاف تھا اور اس کو نظام ،جاحظ، حسن نوبختی، ابو مسلم اصفہانی، وغیرہ نے ترقی دی، علامہ شہرستانی نے زیادہ دقت نظری سے کام لیا اور اختلاف کے چار اصول قرار دیے:

(۱)صفات الٰہی کی اثبات و نفی

(۲)قدر و جبر

(۳)عقائد و اعمال

(۴)عقل و نقل

پہلا اختلاف اس طرح پیدا ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن مجید میں جو آیات متشابہات ہیں مثلاً عرش پر متمکّن ہونا، قیامت کے دن فرشتوں کی جھرمٹ میں ہونا وغیرہ ان کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں یا مجازی اس سوال نے دو فرقے پیدا کر دیے۔ پہلی شق کے ماننے والے محدثین اور اشاعرہ ہیں جن سے تجاوز کرتے کرتے مجسمہ اور مشبہہ نکل آئے، جو خدا کے ہاتھ پاؤں تک مانتے ہیں۔ دوسرے احتمال کے قائل معتزلہ ہیں جن کا دوسرا نام منکرین صفات ہے امام رازی نے سورہ انعام کی تفسیر میں لکھا ہے کہ میرے والد ماجد شیخ ابو القاسم انصاری کی زبانی بیان کرتے تھے کہ اہل سنت و جماعت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت پر ہے اور معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم اور مبرہ عن العیوب ہونے پر ہے اس لیے غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت اور تقدس کے معترف ہیں البتہ فرق اس قدر ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی مصیب ٹھہرا۔

علم کلام کا بانی: محدثین اور ارباب ظاہر کو کلام کی مخالفت میں جو شدت تھی اس نے علم کلام کو بالکل بجھا دیا تھا، لیکن خلفائے عباسیہ نے علم کلام کو ترقی دی، سوائے ایک دو کے، بہر حال مہدی کے زمانے میں علم کلام پیدا ہوا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے سب سے پہلے ابو ہزیل علاف نے اس فن میں کتاب لکھی، ابو ہزیل کا پورا نام محمد بن ہذیل بن عبداللہ بن مکحول ہے۔ ۱۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۵ھ میں وفات پائی، ابو ہذیل علاف نے علم کلام میں چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں اور بہت سے مجوسیوں اور ملحدوں سے مناظرے کیے جن کا اثر یہ ہوتا تھا کہ اکثر ملاحدہ اور مخالفین مذہب بھی اپنے عقائد سے باز آجاتے اور مسلمان ہو جاتے تھے، ابو الہذیل معتزلی کے ہاتھ پر تین ہزار اشخاص اسلام لائے۔ مامون رشید کے دربار میں جتنے بھی علمائے کلام تھے ان میں سب سے نمایاں حیثیت ابو ہذیل اور نظام رکھتے تھے اور ابو ہذیل کے لیے حکومت کی طرف سے ۶۰ ہزار درہم سالانہ مقرر تھے اور خرچ کرنے میں اتنا مخلص تھا کہ ساری رقم اہل علم پر صرف کر دیتا تھا، ابو ہزیل کو معقولات کے علاوہ ادب میں بھی کمال حاصل تھا، ابو ہذیل کے بعد اس کے شاگرد ابراہیم بن سیار نظام نے جو مامون رشید کا استاد اور ندیم خاص تھا علم کلام کو نہایت ترقی دی۔

اشعری علم کلام کی مختصر تاریخ اور اس کا ارتقا

نور الزماں

عقل پرستوں کا ایک گروہ سب سے پہلے سلف سے علاحدہ ہوا۔ یہ نص سے زیادہ عقل سے کام لیتے تھے اور اپنے موقف کے اثبات میں دلائل عقلیہ پیش کرتے تھے، یہی ان کا منہج و مسلک تھا۔ انہوں نے اپنا نام اصحاب العدل والتوحید رکھا جب کہ اہل سنت انہیں معتزلہ (جمہور امت سے کٹا ہوا گروہ) کہنے لگے۔ آہستہ آہستہ اس فرقے کے لوگ نظری ابحاث میں اور دقیق کلامی مسائل میں پڑ گئے، لوگ معتزلہ کے حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافیوں سے متاثر ہو رہے تھے- ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ سے بہت سارے لوگ احساس کمتری کا شکار تھے اور معتزلہ کی عقلیت و فلسفیت سے مرعوب ہو رہے تھے، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام ان فلسفی نما مناظرین کے لیے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے۔ مسلمانوں میں خاص عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی اور اس ابھرتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے محدثین کی محنت، عابدین کا زہد و تقویٰ اور فقہاے اسلام کے فتاوے ناکافی تھے۔ بلکہ اہل سنت و جماعت کو ایک ایسی عظیم شخصیت درکار تھی جس کا علمی معیار معتزلہ سے کہیں زیادہ بلند ہو۔

الغرض مسلمانوں کو فوری طور پر ایک ایسے امام کی ضرورت تھی جو اس میدان میں فتح یاب ہوتا، ایسے وقت میں شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات روشن اوصاف کے ساتھ وجود میں آئی اور ان کے متبعین اشاعرہ سے موسوم ہوئے۔

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا نام علی بن اسماعیل ہے آپ کی ولادت بصرہ میں (۲۷۰ھ) میں ہوئی اور آپ کی وفات (۳۳۰ھ) میں بغداد میں ہوئی۔

امام اشعری نے اپنے استاذ ابوعلی جبائی سے کلامی مناظرے کیے جس کا وہ جواب نہ دے سکے اور اسی وجہ سے تیسری صدی ہجری میں اس فرقے سے امام حسن اشعری رحمہ اللہ الگ ہو گئے اور اہل سنت و جماعت کا موقف اختیار کر لیا، چالیس برس تک معتزلی عقائد کے حامی رہنے کے باوجود امام ابوالحسن اشعری نے پوری طاقت و قوت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ معتزلہ نے دین کے اخذ و فہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقے کے پیشواؤں کی تقلید کی اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا، بلکہ جہاں قرآنی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف آیات قرآنیہ کی تاویل و توجیہ کر لی۔

امام ابوالحسن اشعری فن خطابت اور مناظرہ میں بہت زیادہ ماہر تھے، ابوعلی جبائی کے ساتھ مناظرہ اور جمعہ کے دن بصرہ کی جامع مسجد میں تقریروں کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ شہرت ملی، اس کے علاوہ انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کافی محنت کی اور اپنے عقائد و نظریات کو نشر کیا نیز اسلامی عقائد و نظریات کی صداقت ثابت کی اور ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی جو علم کلام کہلاتا ہے، جس کا مقصد عقلی دلائل سے اسلام کی سچائی ثابت کرنا تھا، معتزلہ کے عقائد سے توبہ کرنے کے بعد بغداد شریف جا کر فقہ و حدیث کی تکمیل کی اور معتزلہ کے رد میں نہایت کثرت کے ساتھ کتابیں تصنیف کیں، شافعیوں میں ان کو عروج و کمال حاصل ہوا جس کی بنا پر ہزاروں علما ان کے شاگرد ہو گئے اور ان کے شاگردوں کی وجہ سے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات تمام دنیا میں پھیل گئیں۔

امام ابوالحسن اشعری کے دور تک علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہیں تھی اس زمانے میں محدثین اور فقہا میں منطق وفلسفہ کا مطلق رواج نہ تھا۔ الغرض دیگر مذاہب والوں کے رد میں کچھ لکھا بھی جاتا تھا تو استدلال میں اسلامی روایتیں اور سندیں ہی پیش کی جاتیں ، امام اشعری کے بعد اہل بدعت کے عقلی شبہات کا جواب بھی عقلی پیرائے میں دیا جانے لگا۔ اس لحاظ سے علم کلام کی ایک نئی تاریخ شروع ہوئی، امام اشعری کے بعد امام غزالی رحمہ اللہ نے علم کلام کی باگ ڈور سنبھالی، امام غزالیؒ کی ذات وہ پہلی عبقری شخصیت ہے جس نے فلسفے کے رد میں مستقل کتابیں تصنیف کیں امام صاحب نے منطق کا سیکھنا فرض کفایہ قرار دیا نیز اس بات کی تصریح کی کہ چند مسائل کے سوا باقی فلسفیانہ مسائل مذہب کے خلاف نہیں ہیں، امام صاحب کی بدولت فلسفے کو قبولیت کا درجہ ملا، امام غزالی کے بعد مذہب وفلسفہ کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونے لگی۔ امام غزالی کے بعد علامہ عبدالکریم شہرستانی نے علم کلام میں بڑی شہرت حاصل کی، علامہ موصوف نے حکما ے یونان میں سے ہر ایک کے فلسفے کا خلاصہ تحقیقی انداز میں تحریر فرمایا۔

امام شہرستانی کے بعد علم کلام کی باگ ڈور امام فخر الدین رازی نے سنبھالی، امام موصوف کا نام محمد بن عمر ہے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ علامہ موصوف جس طرح تفسیر، اصول فقہ اور فقہ کے امام تھے اسی طرح فلسفہ اور عقلیت میں بھی ان کے بعد کوئی شخص ان کا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ علامہ موصوف کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فلسفہ کے پیچیدہ اور دقیق مسائل کو اس طرح آسان کر دیا کہ افلاطون اور ارسطو کا سارا بھرم کھل گیا۔ علامہ موصوف کا علم کلام میں اہم کارنامہ فلسفے کا رد ہے لیکن امام موصوف نے زور طبع کی وجہ سے اس طرح غلو کیا کہ فلسفے کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر دیا، ضروری غیر ضروری کی تمیز نہ رکھی جو فلسفے کے درست مسائل تھے امام صاحب نے ان کو بھی نہیں چھوڑا۔ سب سے پہلے امام صاحب نے کلام کو فلسفہ کے انداز پر لکھا، فلسفہ کے سینکڑوں مسائل علم کلام میں مخلوط کر دیے اور ان کے بعد متاخرین نے علم کلام کو بالکل فلسفہ بنا دیا۔

امام رازی کے بعد بلکہ خود انہیں کے دور میں اسلام کی تباہی کے اسباب پیدا ہو چکے تھے یعنی تاتاریوں کا طوفان اٹھنا شروع ہو چکا تھا ۔ اسی دوران ۵۵۱ھ میں ابوالحسن علی سیف الدین آمدی پیدا ہوئے ، جنہوں نے شام میں معقولات کی تعلیم حاصل کی ، اور اس میں انتہائی درجے کا کمال حاصل کیا، وہ اپنی تصنیفات میں کثرت سے ارسطو کا رد کرتے ، لیکن ان کا انداز تردید الگ تھا کہ جو مسائل واقعی میں اعتراض کے قابل تھے ان پر انہوں نے اعتراضات کیے ۔ امام آمدی اگرچہ اشاعرہ کے متبع ہیں لیکن بعض مقامات پر آزادی سے اشاعرہ پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ علامہ آمدی کے بعد پھر کوئی شخص اس مرتبے کا پیدا نہیں ہوا جس کے کارنامے کو ذکر کرنا ضروری سمجھا جائے ۔ البتہ قاضی عضد الدین ، علامہ تفتازانی ، وغیرہ نے علم کلام میں ضخیم کتابیں لکھیں ، لیکن اولا تو جو کچھ ہے امام رازی اور آمدی صاحب کی خوشہ چینی ہے ، دوسرا یہ کہ ان کتابوں میں خالص فلسفے کے مسائل اس قدر شامل ہیں کہ فلسفہ و کلام میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔

علامہ ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے کلامی افکار پر ایک نظر

ریان فاروقی

ابن رشد کی کلامی فکر: علامہ ابن رشد نے علم کلام پر دو کتابیں لکھیں۔ پہلی فضل المقال و تقریر ما بین الشریعتہ والحکمتہ من الاتصال اور دوسری الکشف عن مناھج الادلۃ فی عقائد الملۃ علامہ ابن رشد نے پہلی کتاب میں منطق و فلسفے کے جواز اور عدم جواز پر گفتگو کی ہے۔ جواب میں فرمایا ہے کہ اس کا سیکھنا واجب ہے یا پھر کم از کم مستحب ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب میں قرآنی نصوص میں تاویل کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآنی نصوص کی تاویل میں علما کے دو فریق ہیں۔ ایک فریق جو تاویل کو محض ناجائز قرار دیتا ہے اور دوسرا فریق جواز کا قائل ہے۔ ابن رشد نے اس مسئلے میں ایک تیسرا پہلو اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تاویل ان لوگوں کے لیے جائز ہے جو ماہرین اور اہل نظر ہیں اور رہا عام لوگوں کا معاملہ تو ان کو ظاہری معنی کی تلقین کرنی چاہیے اور جو ان کی سمجھ سے پرے ہو تو ان کو یہ سمجھانا چاہیے کہ یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے بس ایمان لانا ضروری ہے۔ متکلّمین عام لوگوں کو سمجھانے کے لیے اس طرح مثال قائم کرتے ہیں کہ کہا جائے کہ خدا ہے لیکن نہ اس کا کوئی مقام ہے، نہ جگہ ہے، اور نہ ہی جہت ہے، تو عام لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ممکن ہے کہ آجائے کہ خدا سرے سے ہے ہی نہیں لہذا ایسی صورت میں ان کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ تاویل کیے بغیر محض اس پر ایمان رکھیں۔ مزید یہ کہ اس کتاب میں اشاعرہ کی گرفت بھی کی ہے، اور کہا ہے کہ قرآنی آیتوں کے متعلق ان کا طریقہ نہ عقلی ہے نہ نقلی، اس لیے اشاعرہ محدثین کی طرح ظاہری معنی مراد نہیں لیتے، اور جن نصوص میں تاویل کرتے ہیں وہ منطق و فلسفے کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں۔

علامہ ابن رشد نے اپنی دوسری کتاب میں اشاعرہ، معتزلہ اور باطنیہ کے معتقدات اور ان کے استدلال کو غلط ثابت کیا ہے، پھر اثبات باری، توحید، صفات باری، حدوث عالم، بعثت انبیا، قضا و قدر اور معاد وغیرہ کی حقیقت کو بیان کیا ہے، اور ان پر عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ابن رشد نے متعدّد مسائل میں جمہور اشاعرہ سے مخالفت کی ہے، خاص طور پر معجزے کے متعلق اختلاف قابل ذکر ہے، معجزے کے ثبوت کے لیے نبوت کا ہونا ضروری ہے اور خرق عادت انبیا کے علاوہ سے بھی ہو سکتا ہے یہ اشاعرہ کا موقف ہے۔ لیکن ابن رشد نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ مجھے یہ بات تسلیم نہیں کہ معجزے سے نبوت پر استدلال ہو سکتا ہے اور اپنی بات کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ ابتدا سے آج تک معجزہ جب بھی صادر ہوا ہے تو انبیاء سے ہی ہوا ہے تب تو یہ دلیل گذشتہ انبیاء کے لیے درست ہوگی لیکن جو نبی سب سے پہلے تشریف لائے ان پر کس طرح سے یہ بات ثابت ہوگی کہ انبیاء وہ ہیں جن سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ابن رشد نے اشاعرہ سے خرق عادت انبیاء اور دیگر مسائل میں بھی متعدّد مقامات پر اختلاف کیا ہے۔

ابن تیمیہ کی کلامی فکر: علم کلام کے کئی ایسے مسائل جو اصول کی طرح مسلم ہو گئے تھے، ان پر کسی کو بھی کلام کرنے کی ہمت نہ تھی، لیکن علامہ ابن تیمیہ نے نہایت دلیری اور اعلانیہ طور پر ان کی مخالفت کی، اس بات کا بھی اظہار کیا کہ متکلّمین جس چیز کو مذہب بنا کر پیش کرتے ہیں وہ در حقیقت مذہب نہیں بلکہ مذہب کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ فلسفے کے سخت دشمن تھے، اس کے باوجود آپ فلسفے کی گہری معرفت رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر آپ لکھتے ہیں کہ حکمائے یونان نے علوم طبعی و ریاضی کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے ان علوم میں ان کے اقوال بنسبت متکلّمین کے زیادہ صحیح ہوتے ہیں، کیوں کہ ان علوم میں متکلّمین کا اکثر کلام عقل و نقل اور شریعت

پر مبنی نہیں ہوتا۔ اسی طرح حسن وقبح کے بارے شیخ ابن تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اکابرین جس حسن وقبح کے قائل تھے اس کا سب سے پہلے انکار شیخ ابوالحسن اشعری نے کیا، اور حسن وقبح کا انکار امام اشعری کی ایجاد ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کوئی بھی چیز فی نفسہ نہ خیر ہے نہ ہی شر، اس کے خیر اور شر ہونے کا علم صرف وحی سے حاصل ہو سکتا ہے عقل سے نہیں۔

شاہ ولی اللہ کی کلامی فکر: شاہ صاحب نے علم کلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انہوں نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کیے ہیں وہ در حقیقت علم کلام کی روح ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں درج ذیل مسائل کلامیہ پر بحث کی ہے۔ جیسے انسان مکلف کیوں پیدا کیا گیا، خدا کی عادت یا فطرت میں تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی، روح کی حقیقت، جزا و سزا کی حقیقت، واقعات قیامت کی حقیقت، عالم مثال، نبوت کی حقیقت، تمام مذاہب کی اصل ایک ہے بعد والوں نے اس میں کمی بیشی کی ہے، اختلاف شریعت کے اسباب اور ایک ایسے مذہب کی ضرورت جو تمام مذاہب قدیم کا ناسخ ہو، پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب نے ان تمام مسائل پر بحث کرتے ہوئے اہل بدعت کے اسلامی مسائل کے تعلق سے جو اعتراضات تھے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں مثلاً اہل بدعت کہتے ہیں کہ عذاب قبر، حساب، پل صراط، میزان کو عقل سے کیا تعلق، رمضان کے آخر دن کا روزہ واجب اور شوال کی پہلی تاریخ کا حرام ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ ترغیبات و ترہیبات کے تعلق سے شبہات وغیرہ علم کلام میں اب تک ان موضوعات پر گفتگو نہیں ہوئی تھی، جس کی بنا پر لوگ اسلام کا مذاق اڑاتے تھے، شاہ صاحب نے ان تمام اختلافات کا شائستگی اور اچھے اسلوب میں جواب دیا۔ الغرض علامہ ابن رشد، شیخ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نظریات تاریخ علم کلام میں منفرد اہمیت کے حامل ہیں، جس کو علم کلام کا ایک طالب علم نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

مفہوم جہاد

اسلام ایک جامع نظام حیات ہے، جو بیک وقت جسم عقل اور روح کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ حیات انسانی کے ان تینوں پہلوؤں کی تکمیل و تسکین کے لیے اس نے جہاد، اجتہاد اور مجاہدے کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ یہ تینوں امور "جہد" کے مادے سے مشتق ہیں۔ جہد یعنی خیر کی کوشش ان تینوں میں قدر مشترک ہے۔ حیات انسانی کو صحت مند، پر امن اور پر سکون رخ پر رواں دواں رکھنے کے لیے مذکورہ بالا تینوں امور نہایت ضروری ہیں۔

جہاد کا تعلق جسم انسانی یعنی انسان کے مادی سکون و قرار سے ہے۔ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام اور ظلم و جبر کے خاتمے کے لیے یہ فوجی اور قانونی طریقہ اپناتا ہے۔ حیات انسانی کی پر امن اور بے ضرر بقا کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے، بشرطیکہ اپنی درست بنیادوں پر قائم ہو۔ زیر نظر کتاب اسی کی درست تعبیر و توجیہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

اجتہاد کا تعلق عقل انسانی یعنی علمی تحقیق و تفکیر سے ہے، جو بدلتے حالات میں انسانی معاشرے کی صالح، مفید اور اخلاقی قدروں کے تعین اور ترقی پذیر معاشرے کو فساد سے بچانے اور صلاح سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو انسانی معاشرہ یا تو ترقی سے رک جائے یا پھر ترقی کی اس سرحد پر پہنچ جائے جہاں انسانیت کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔

مجاہدہ کا تعلق روح انسانی یعنی تزکیۂ نفس اور احسان (تصوف) سے ہے۔ اس سے انسان روحانی سکون پاتا ہے اور اس کی اخلاقی و روحانی قدروں کی حفاظت ہوتی ہے اس کے ذریعے خلق اور حق کا عرفان ہوتا ہے یہ نہ ہو تو انسان محض ایک جانور بن جائے۔

(ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی کی کتاب **"تفہیم جہاد"** سے اقتباس)